۱۵ مئی ۱۹۶۷ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۹۲۲
فون نمبر ۲۹

ایڈیٹر
آل احمد سرور

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی کاپی بیس پیسے

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

ہفتہ وار ہماری زبان

جلد ۳۰ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۱۹

اداریہ

شعر اور سیاست

کہا جاتا ہے کہ مختلف لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں زبان بھی ایک نہایت موثر آلہ ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اردو علاوہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہونے کے پاکستان کی سرکاری زبان بھی ہے۔ یہ تو درست ہے کہ وہاں علاقائی زبانوں کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ پنجاب میں پنجابی، سرحد میں پشتو، سندھ میں سندھی اور بلوچستان میں بلوچی اپنی اپنی ریاستوں میں سرکاری زبانیں ہوں، مگر رابطے کی زبان کے طور پر اردو کا استعمال، غالباً پھر بھی ناگزیر رہے گا۔ اس وقت پاکستان کے دانش وروں، ادیبوں، قومی کارکنوں اور پڑھے لکھے لوگوں کو بہر حال اردو کے ذریعہ سے جس طرح متاثر کیا جا سکتا ہے دوسری زبانوں کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں خوشی ہے کہ کچھ عرصہ ہوا جب وزیر اعظم کے ایلچی جناب درگا پرشاد دھر ہند پاکستان کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس کے لئے ایجنڈا مرتب کرنے کی غرض سے اسلام آباد گئے تو انھوں نے اردو زبان کی مقبولیت کو پیش نظر رکھا۔ جب وہ مذاکرات کے اختتام کے بعد دہلی واپس آ رہے تھے تو پاکستان کے اخبار نویسوں نے قدرتی طور پر ان سے مذاکرات کے سلسلے میں بہت سے سوالات کئے۔ ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق دھر صاحب نے ان سوالات کے جواب میں اپنی جیب سے ایک کتاب نکالی، یہ مشہور اردو شاعر فیض کا تازہ ترین مجموعۂ کلام تھا۔ اس میں سے انھوں نے ایک نظم "دعا" پڑھی۔ دھر صاحب کے اس نظم کے پڑھنے اور گویا اُن کے سوالات کا اس طرح جواب دینے کا پاکستان کے اخبار نویسوں پر بہت اچھا اثر ہوا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ نظم نے جو کام کیا وہ خاص لمبی تقریر نہ کر سکتی۔ بعض اوقات شاعر کا ایک شعر تقریروں اور مقالات پر بھاری ہوتا ہے۔ ہم ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لئے یہ نظم درج کر رہے ہیں۔

"دعا"

۱۔ آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
۲۔ ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
۳۔ ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
۴۔ کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں
۵۔ آئیے عرض گزاریں کہ نگار ہستی
۶۔ زہر امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
۷۔ وہ جنھیں تاب گرانباریٔ ایام نہیں
۸۔ ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے
۹۔ جن کی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
۱۰۔ ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
۱۱۔ جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
۱۲۔ ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے
۱۳۔ جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
۱۴۔ ہمت کفر ملے جرأت تحقیق ملے
۱۵۔ جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں اُن کو
۱۶۔ دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

۱۷۔ عشق کا تیر نہاں، جان تپاں ہے جس سے
۱۸۔ آیئے اقرار کریں اور تپش لگ جائے
۱۹۔ حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
۲۰۔ آیئے اقرار کریں اور خلش مٹ جائے

ہندوستان کی خواہش یہ ہے کہ برصغیر میں دائمی امن کے لئے اور اس ترقی پذیر علاقے کو خوشحالی، سماجی انصاف اور ذہنی اور مادی ترقی کی بلندی تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش ایک دوسرے کے اور قریب آئیں اور تضاد کی جگہ تعاون کا طریقہ اپنائیں۔ اس مقدس مشن میں اردو زبان بہت مفید ہو سکتی ہے، اردو امن اور دوستی کی علامت ہے۔ اردو شاعری ہر دور میں تہذیب اور انسانیت کا گیت رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادیب اگر ایک دوسرے سے اور قریب ہوں تو خیرسگالی اور دوستی کے یہ جذبات دونوں طرف اور بڑھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جلد سے جلد وہاں کی کتابیں اور رسالے یہاں آسکیں اور یہاں کی وہاں جاسکیں۔ نیز دونوں ملکوں کے ادیبوں کے خیرسگالی کے وفد جتنی جلد ممکن ہو آجاسکیں تو یقیناً ہندوستان اور پاکستان جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے۔ امید ہے کہ چوٹی کی کانفرنس میں یہ پہلو بھی دونوں ملکوں کے سربراہوں کے پیش نظر رہے گا۔

ہندی اردو اور سنسکرت کی کتابوں پر انعامات

لکھنؤ۔ حکومت اترپردیش نے ہندوستان بھر کے مصنفوں اور مترجموں کو انعامات دینے کے واسطے ہندی، اردو اور سنسکرت میں اعلا درجہ کی طبع زاد تخلیقات اور ترجمے طلب کئے ہیں۔ ریاستی حکومت کے ہندی لٹریچر فنڈ سے ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران ادب سائنس، قانون اور فلسفہ قانون فلسفہ اور تاریخ سے متعلق کتابوں پر ۲ ہزار ۵۰۰ روپیہ کے انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔

انعامات کے لئے ایسی کتابوں پر غور کیا جائے گا جو یکم جنوری ۱۹۷۰ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کے درمیان شائع ہوئی ہوں اگر کسی خاص موضوع پر کوئی اعلا درجہ کی کتاب موصول نہ ہوئی تو اس موضوع پر انعام نہیں دیا جائے گا۔ کسی شخص کو متواتر دو سال تک ایک ہی انعام نہیں دیا جائے گا۔

ہر کتاب کے آٹھ نسخے سکریٹری پرسکار ریچیا سمتی ایجوکیشن (۴) ڈپارٹمنٹ کاؤنسل ہاؤس لکھنؤ کو ۳۱ مئی ۱۹۷۲ء تک موصول ہونا چاہئے۔ یہ کتابیں مصنفین یا ناشرین کو واپس نہیں کی جائیں گی۔ انعام کے لئے جو کتابیں پیش کی جائیں اس کے ہر نسخہ پر تاریخ اشاعت اس انعام کا نام جس کے لئے کتاب پیش کی گئی ہے۔

مصنف اور ناشر کا نام اور مکمل پتہ درج ہونا چاہئے مصنف کو اس امر کی تصدیق کے لئے ایک سرٹیفکٹ بھی پیش کرنا چاہئے کہ اس کو اس کتاب کی تیاری اور اشاعت کے سلسلہ میں حکومت اترپردیش سے کوئی مالی امداد نہیں ملی ہے۔

اترپردیش ہندی سمتی کی شائع کردہ کتابیں بھی انعام کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں۔

قومی آواز

جلوہ گاہ غالب

بستی حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی میں مرزا غالب کی ابدی آرام گاہ سے متصل غالب اکیڈمی کی چار منزلہ عمارت باہر سے ہی دعوت نظارہ دیتی ہے غالب اکیڈمی میں ریسرچ لائبریری کے علاوہ غالب اور ان کے عہد سے متعلق ایک میوزیم (جلوہ گاہ)، آرٹ گیلری (نقوش گاہ) اور جدید سامان سے آراستہ ایک آڈیٹوریم (جلسہ گاہ) بھی ہے۔ میوزیم میں غالب سے متعلق دستاویزات، ان کے عہد کے ملبوسات، ان کی مرغوب غذائیں، ان کے معاصرین کی تصویریں اور اس قسم کی دوسری یادگار اشیاء جلوہ آرا ہیں۔ اکیڈمی میں کتابوں کی فروخت کے لئے بھی ایک سیکشن قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں غالبیات اور اردو کی دیگر معیاری کتب کی فروختگی کا معقول انتظام ہے۔ غالب کے قدردان ارباب فہم و دانش کا اکیڈمی کو خصوصی تعاون درکار ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ جن حضرات کے پاس غالب اور ان کے عہد سے وابستہ یا غالب صدی تقریبات سے متعلق اشیاء کسی بھی زبان میں موجود ہوں وہ ازراہ التفات اکیڈمی کو بھجوا دیں تاکہ وہ سب چیزیں عمدگی کے ساتھ محفوظ کر دی جائیں۔

• ذہین نقوی معتمد اعزازی

صفحہ ۱۰ سے آگے

عام قارئین کو کیا فیض پہونچ سکتا ہے؟ رشید حسن خاں کو بطور محقق فرہنگ پر جو توجہ کرنی چاہئے تھی، وہ انھوں نے شاید اس لئے نہیں کی کہ اگر وہ یہ کام کرتے تو ان کو "کثیر التصانیف" بزرگ بننے کا شرف کیوں کر حاصل ہوتا۔ جو شخص الفاظ کے صحیح معنی بھی متعین نہ کر سکے اس سے تحقیق کے کسی مفید کام کی توقع رکھنا سادہ لوحی ہے۔ علمی مباحث اور شعر میں اس کی رائے کیا وقعت رکھ سکتی ہے؟

رشید حسن خاں کے مرتب دیوان میں صرف ایک خوبی ہے کہ اس کی کتابت طباعت بہت عمدہ اور صحیح ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں مکتبہ جامعہ، کاتب اور پریس والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اس خوبی پر مرتب کا کوئی بس نہ تھا۔ مکتبہ جامعہ لائق مبارکباد ہے کہ اس نے اردو کے دیوان کا ایک سستا ایڈیشن شائع کیا۔ اسے پڑھنے والا اگر تعارف اور فرہنگ سے قطع نظر کرے تو فائدے میں رہے گا۔

ڈاکٹر نورالسعید اختر

سب رس میں ہندی کے دوہے

قدیم اردو کے محققین نے متفقہ طور پر ملا اسد اللہ وجہی کی سب رس کو ایک شاہکار تصنیف سمجھا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سنہ ۱۹۳۲ء میں اس شہ پارے کو منظر عام پر لائے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء میں اس نادر الوقت کتاب کا دوسرا ایڈیشن بابائے اردو کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد شائع ہوا۔ اس طبع ثانی کے مختصر سے مقدمے میں بابائے اردو رقمطراز ہیں ؂

"یہ نادر کتاب جو نثر میں اردو کی سب سے قدیم اول تصنیف ہے اوّل بار سنہ ۱۹۳۲ء میں انجمن ترقی اردو نے مرتب کرکے شائع کی۔ اب بیس برس بعد دوبارہ شائع کی جاتی ہے۔ اس عرصے میں تین اور مثنویاں دستیاب ہوئیں جن میں یہی قصہ سب رس کے تتبع میں نظم کیا گیا ہے۔ ان تینوں کا مختصر تذکرہ بھی میں نے اپنے مقدمے میں کر دیا ہے۔

جو غلطیاں طبع اوّل میں رہ گئی تھیں۔ ان کی تصحیح کردی گئی ہے اور فرہنگ پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔

عبدالحق۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء"[1]

اس میں شک نہیں کہ بابائے اردو نے طبع اوّل کی خامیوں کو طبع دوم میں بڑی حد تک دور کر دیا ہوگا لیکن اردو اور بالخصوص قدیم اردو کی کتابوں کی چھپائی میں کتابت اور پریس کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ کتابت کی سیکڑوں غلطیوں کے باعث اصل متن کی شکل ہی بدل جاتی ہے اور کبھی کبھی پریس والوں کی کرم فرمائی وبال جان بن جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ نہ کاتب کو قدیم اردو سے واقفیت ہوتی ہے اور نہ ہی پریس والے اس میں کچھ درک رکھتے ہیں۔ لہٰذا ترمیم اور مزید ترمیم کے بعد متن ایک نیا روپ دھار لیتا ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں قدیم اردو کے شہ پاروں کو از سر نو نہایت احتیاط کے ساتھ مرتب کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی کی کاوشوں سے قدیم اردو کے چند گلہائے سرسبد منظر عام پر آئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب جامعہ دہلی کی جانب سے سب رس کو ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر موصوف سب رس کی تصحیح ترتیب و تہذیب کے دوران ان امور پر بھی روشنی ڈالیں۔

جیسا کہ معلوم ہے سب رس ایک تمثیلی داستان ہے۔ وجہی نے داستان کے ضمن میں پند و نصیحت کے دفتر کھول دئے ہیں۔ کہیں داستان کی رنگ آمیزی اور کہیں صوفیانہ افکار کی ترجمانی کے لئے احادیث، اقوال، قرآنی آیات، فارسی اشعار، قدیم اردو کے اشعار اور ہندی کے دوہے استعمال کئے ہیں۔ ان باتوں سے داستان دلکش اور پند و نصائح موثر بن گئے ہیں۔ یہ چیزیں اپنی اپنی جگہ کافی اہم ہیں۔ ان اشعار وغیرہ سے ہمیں مصنف کی قابلیت اور مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کن کن مصنفوں سے متاثر ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار کی توجہ سب رس میں پائے جانے والے ان چند ہندی دوہوں پر ہے جو یا تو غلط نقل ہوئے ہیں یا پھر ہمیں ان کے خالقین کا علم نہیں ہے۔ اگر ان دوہوں کے کہنے والوں کا صحیح طور پر پتہ نہ لگایا جا سکا تو ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ یہ دوہے بھی ملا وجہی ہی کے ہیں۔

تحقیق و جستجو کے بعد چھ دوہوں میں سے صرف ایک کے اصل مصنف کا پتہ چل سکا ہے لیکن سب رس میں اس کے پہلے مصرعہ کی شکل تھوڑی بدلی ہوئی ہے۔

سب رس کے ابتدائی اقتباس میں حدیث اور فارسی کہاوت کے بعد کبیر داس کا دوہا بطور حوالہ درج ہے۔ کبیر کے بیان کے مطابق وہ بنارس میں پیدا ہوئے اور مگہر (ضلع گورکھپور) میں وفات پائی۔

"سگل جنم شیو پوری گنوایا
مرتے بیر مگہر اٹھ دھایا"[2]

کبیر کے سنہ وفات کا تعین اندازاً سنہ ۱۵۱۸ء مطابق سنہ ۹۲۴ھ ہو سکتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ سب رس کی تصنیف (۱۰۴۵ھ مطابق سنہ ۱۶۳۵ء) سے قبل کبیر کا انتقال ہو چکا تھا عیسوی سنہ کے اعتبار سے ۱۱۷ سال اور ہجری سن کے مطابق ۱۲۱ سال کے بعد وجہی نے کبیر کا حوالہ پیش کیا۔ اور اس کے پیش کردہ حوالہ دیں انھوں نے ایک نئی بات لکھی جو قابل غور ہے۔

وجہی نے گو امر کے جاتر ان[3] کے حوالے سے سنت کبیر کا دوہا پیش کیا ہے وہ اس طرح ہے ؂

پوتی تھی سو کھو لی سبھی پنڈت بھیا نہ کوئے
ایکی اچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

ڈاکٹر شام سندر داس نے کبیر گرنتھاولی میں یہ دوہا یوں پیش کیا ہے ؂

पोथी पढि पढि जग मुआ पंडित भया न कोई
ढाई आखर प्रेम का पढै सु पंडित होइ

(کبیر گرنتھاولی، ص۔ ۳۰) (ص۔ ۲، ۱۱۶)

یہی دوہے کو جناب سردار جعفری نے کبیر وانی میں اس طرح لکھا ہے ؂

---

[1] سب رس: وجہی، مرتبہ مولوی عبدالحق، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی ص: ۵

[2] کبیر وانی سردار جعفری ۱۹۶۵ء ص ۱۲

[3] سب رس وجہی متن ص: ۱

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے

ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے [1]

اس دوہے کی وضاحت کرتے ہوئے جعفری صاحب رقمطراز ہیں کہ: "اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دیوناگری میں جب پریم "प्रेम" لکھا جاتا ہے تو اس میں صرف ڈھائی حرف ہوتے ہیں" [2]

مضمون نگار کا خیال ہے کہ وجہی نے کبیر داس کا مندرجہ بالا دوہا "گو ایر کے جا ٹراں" سے نہیں بلکہ "گو ایر کے ٹھاکراں" سے اخذ کیا ہے جنھیں وہ گن کے گراں [3] بھی کہتے ہیں۔ اس قیاس کو اس حقیقت سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ گوالیر پر ایک مدت تک ٹھاکروں کی حکومت رہی ہے۔ لہٰذا وہاں ٹھاکروں کی زبان رائج ہوگی اور کبیر جیسے مقبول عام شاعر کا کلام زبان زدِ خاص و عام ہوگا۔

وجہی دکن کے باشندے تھے انھوں نے کبیر کے دوہے کسی سے سنے ہوں گے یا کہیں پڑھے ہوں گے۔ تاریخوں اور وجہی کی تصانیف سے ان کے کسی دور دراز سفر کا پتہ نہیں چلتا، نہ ہی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ کبیر نے اپنے دور میں جنوبی ہندوستان کا سفر کیا تھا لہٰذا سب رس کی تصنیف کے دوران وجہی نے یہ دوہے یقیناً اپنی یادداشت کے مطابق لکھے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ ان کی صحت میں فرق آگیا ہے اور غلط نقل ہوئے۔

ڈاکٹر رام چین سنگھ بھٹر صدر شعبۂ ہندی زیویا کالج بمبئی نے مضمون نگار کو بتایا کہ بقیہ پانچ دوہوں میں سے ایک اور دوہا کبیر ہی کا ہے جو کبیر کی ساکھیوں (साखियों) میں پایا جاتا ہے دوہرہ ملاحظہ ہو ؎

دھیرے دھیرے رے منا دھیرے سب کچھ ہوئے

مالی سینچے سو گھڑا رت آئے پھل ہوئے

یہ دوہا دیوناگری میں یوں لکھا جاتا ہے ؎

धीरे धीरे रे मना धीरे सब कुछ होय

माली सींचे सौ घड़ा ऋतु आये फल होय।

وجہی نے اس دوہے کو قدرے بدلی ہوئی شکل میں لکھا ہے ؎

دھرتی بہانے ریچ دھر ریچ بھر کر بوئے

مالی سینچے سو گھڑا رُت آئیں پھل ہوئے [4]

ذیل میں مزید چار دوہے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں دئے جاتے ہیں۔ یہ چار دوہے سب رس میں موقعہ بموقعہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے صحیح ہونے میں مضمون نگار کو شک ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ یہ دوہے کس کے ہیں؟ مضمون نگار اشارتاً صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ دوہے امیر خسرو، گرو نانک یا رحیم کے ہو سکتے ہیں ؎

دوہا نمبر۱ سات سہیلی ایک پیو چو دھر پیو پیو ہوئے
सात सहेली एक पिउ, चौधर पिउ पिउ होय

جس پر پیو کا پیار ہے سو دھن برے کوئی
जिस पर पिउ का प्यार है, सो धन बिरलै कोय।

(برے बिरलै یعنی شاذ و نادر) سب رس نسخہ انجمن ص ۲۲
" " " دہلی ص ۲۰

دوہا نمبر۲ کبھوں ست نہ چھاڑیئے ست چھوڑیں پت جائے
اے لچھمی ست کی داس ہے پگ لاگے تجھ گھر آئے
سب رس، نسخہ انجمن ص ۱۹۹/۱۵۶
कबहूँ सत ना छाड़िये सत छोड़े पत जाय।
ऐ लछमी सत की दास है पग लागे तुझ घर आय

دوہا نمبر۳ جے میں کہی سو ان کیا پریت ہے اس دھات " ص ۱۹۸
دو من کا ایک من بھیا اب دو کی ایک ہی بات " ص ۱۸۸
जे मैं कही सो उन किया प्रीत है अस धात।
दो मन का एक मन भया, अब दो की एक ही बात॥

دوہا نمبر۴ جن کوں درس رات ہے تن کوں درس ذات " ص ۱۷۱
جن کوں درس رات نہیں تن کوں رات نہ ذات " ص ۲۲۷
जिन को दर्शन रत है तिन को दर्शन ज़ात।
जिन को दर्शन रत नहीं तिन को रत न ज़ात॥

ہماری زبان کے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ان دوہوں سے متعلق تفصیلی معلومات ہماری زبان کے ذریعہ ہم تک پہنچا کر ممنون فرمائیں۔

---

[1] کبیر بانی: سردار جعفری ص ۸۰
[2] " " " "
[3] سب رس از ملا وجہی ص
[4] " " " "
[5] سب رس از وجہی ص ۱۰ طبع ثانی تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی

مرزا خلیل احمد بیگ

خالق باری اور مثلِ خالق باری

شمالی ہندوستان میں اردو کی اب تک جتنی تصانیف دستیاب ہوئی ہیں ان میں "خالق باری" مصنفہ ضیاء الدین خسرو سب سے قدیم تصنیف مانی گئی ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۱ء ہے۔ لیکن "خالق باری" سے تقریباً ستر سال قبل ۹۶۰ھ مطابق ۱۵۵۲ء میں اجی چند پسر دلی چند ساکن شہر سکندر آباد نے خالق باری ہی کی شکل ایک منظوم لغت لکھی تھی جس کا تعارف ڈاکٹر عبد الحق نے انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں پیش کیا ہے۔ وہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں "خالق باری یا اس قسم کی جتنی کتابیں اس سے قبل لکھی گئی ہیں، ان سب میں یہ کتاب سب سے قدیم ہے۔" جن اشعار سے تاریخ تصنیف اور مصنف کے نام اور وطن کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ یہ ہیں:

در سنہ نہ صد و شصت حسابے   بتوفیق حق شد کتابے
..... لغت فارسی ہندوی   سخن نظم نمودن جز بدوی
اجیچند پیشانگر بندا   پسر دلی چند شعر کندا
کر بجرم فرماندا دا   ساکن شہر سکندر آباد
مستقل دار الملک مقام   حضرت دلی نادر نام

بقول ڈاکٹر عبد الحق "مصنف نے اپنے اور کتاب کے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے لیکن کتاب کا نام کہیں نہیں بتایا۔" غالباً یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبد الحق نے اس تصنیف کو "مثل خالق باری" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ تصنیف اکیس صفحات پر مشتمل ہے اور اشعار کی کل تعداد ۲۷۵ ہے۔ اس کا آغاز حمد سے ہوتا ہے جس کے اشعار یہ ہیں:

باری تعالیٰ نام گسائیں   جسے بزرگی بہت بڑائی
خالق جن جگ پیدا کیا   رازق سب کو بھوجن دیا
واحد ایک پرستش پوجا   لاشریک کوئی اور نہ دوجا
ماہد پید نہ مائی باپ   ہست خودی خود آپی آپ
الکہ نرنجن عالم غیب   ازل بداں پاک بے عیب

پوری کتاب میں موضوع کے لحاظ سے مختلف عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن کی تعداد ۲۹ ہے۔ شروع کے تین عنوانات (۱) مدح (۲) آغاز کتاب اور (۳) مدح بادشاہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام عنوانات کسی نہ کسی "خانہ" سے متعلق ہیں مثلاً مطبخ خانہ، خزانہ خانہ، پائگاہ خانہ، فیل خانہ، شتر خانہ، فراش خانہ، شمع خانہ، خیاط خانہ، شراب خانہ، شکار خانہ، میوہ خانہ، طبیب خانہ، موسیقی خانہ، دار الضرب خانہ وغیرہ۔ خالق باری میں مختلف موضوعات کے لئے عنوانات نہیں قائم کئے گئے ہیں بلکہ فصل کے تحت اشیا کا بیان ملتا ہے اس طرح پوری کتاب میں پچاس دو ہشتم فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

چونکہ اجی چند کی تصنیف اس دور کے نصاب کے لئے لکھی گئی تھی اس لئے مصنف نے ہر عنوان کے تحت اس سے متعلق فارسی الفاظ و محاورات اور ان کے ہندوی (اردو) مرادفات کا ذکر کیا ہے۔ ہندوی کے مرادفات بعض اوقات بہت اوق اور ٹھیٹ ہو جاتے ہیں مثلاً الکہ نرنجن، رتلا، جھادکہ، پانگ، بیراگ، دھکالا، بدیا وغیرہ۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر عبد الحق کا خیال ہے "مترادف الفاظ چونکہ ہندوی بیان کرنے مقصود تھے اس لئے صرف ٹھیٹ ہندی لفظ لکھے گئے ہیں ورنہ اس وقت کی زبان میں بھی فارسی عربی خصوصاً فارسی الفاظ بہ کثرت شریک ہو گئے تھے۔" ہندی لفظوں کے مترادفات کے علاوہ اس میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور فقرے بھی آئے جو آجکل بھی تقریباً اسی طرح بولے جاتے ہیں۔ مثلاً "کہہ نہ سکوں گفتم نتوانم، تنہا ماندن رہے اکیلا، زاغ سیہ ہے کوا کالا۔" وغیرہ۔ بعض جگہ ہندوی مترادفات کے لئے فارسی کے ہم معنی عربی الفاظ بھی دئے گئے ہیں مثلاً "حوت ماہی مچھلی جان" "خبر زبان در ہندوی ردھی" "فرع شاخ ہے ڈالی کہان" "بزم مجلس سبھا پہچان" وغیرہ۔

مصنف نے فارسی و عربی الفاظ و محاورات کے مترادفات بیان کرتے ہوئے جگہ بہ جگہ لفظ "ہندوی" استعمال کیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی اپنی زبان کو ہندی نہیں کہا ہے جبکہ خالق باری میں اس دور میں بولی جانے والی زبان کے لئے "ہندوی" اور "ہندی" دونوں نام ملتے ہیں۔

اس کتاب میں اسما کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جن میں سے بیشتر آج بھی مستعمل ہیں۔ اسماء کے علاوہ مصدر، صفت، ضمیر، امر اور اکا دکا مضارع اور ماضی مطلق کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

ہند آریائی زبانوں کے صوتی ارتقا میں /ڑ/ اور /ڑھ/ کی آوازیں بہت بعد میں داخل ہوئی ہیں۔ ابتدا میں ان اصوات کی کوئی متعین شکل نہیں تھی۔ اس تصنیف میں /ڑ/ کی آواز تو پائی جاتی ہے لیکن کہیں کہیں یہ آواز /د/ اور /ڈ/ سے بدل جاتی ہے۔

/ڑ/ کی جگہ پر /د/ کا استعمال:

بدائی ے بڑائی

جھاد ے جھاڑ

/ڑ/ کی جگہ پر /ڈ/ کا استعمال:

گاڈی ے گاڑی

بڈائی ے بڑائی

چند مثالوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام جگہوں پر /ڑ/، /ڑھ/ اور /ڈ/، /ڈھ/ کا استعمال بالکل اسی طرح ہوا ہے جیسا کہ موجودہ اردو میں ہوتا ہے۔ مثلاً لڑائی، جڑ، کڑوا، گھڑسال، گھڑی، پڑھنا، ڈالی، سونڈ، ڈھول، ڈھیر، ڈورا وغیرہ۔ خالق باری میں جو اس تصنیف کے تقریباً ستر سال بعد لکھی گئی ہے /ڑ/ کو /ڈ/ یا /د/ سے بدلنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس تصنیف کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے "اس کی زبان وہی ہے جو دہلی میں اس وقت مروج تھی یہ بظاہر وہی زبان ہے جسے علامی ابوالفضل زبان دہلوی کہتے ہیں اور جو وہاں سے اطراف ملک میں پھیلی"۔ مصنف (اجی چند) نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ "ساکن شہر سکندرآباد" ہے جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے بلند شہر برج بھاشا کا علاقہ ہے۔ اس تصنیف میں برج کے اثرات کا نہ پایا جانا تعجب خیز امر ہے جب کہ "بکٹ کہانی" پر برج بھاشا کے اثرات کافی نمایاں ہیں۔ بکٹ کہانی کے مصنف افضل کا تعلق پانی پت یا نارنول سے تھا جو ہریانی کا علاقہ ہے۔

خالق باری کو مرتب کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی نے اس کے دیباچہ اوّل اور دیباچہ دوم میں خالق باری کا بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اس طرز پر لکھے جانے والے بہت سے نصابوں مثلاً نصاب الصبیان، قصیدہ در لغات ہندی، اللہ خدائی، حمد باری، نصاب مصطفےٰ، اللہ باری، حمد باری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اجی چند کی اس تصنیف کا ذکر ان کے دیباچوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ شیرانی کے خیال میں "اردو نصابوں کا سلسلہ غالباً دسویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔" انھوں نے دسویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے ایک بزرگ حکیم یوسفی کا ذکر کیا ہے جنھوں نے "قصیدہ در لغات ہندی" کے نام سے ایک نظم لکھی ہے جس میں فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی مترادفات بھی دئے ہیں اور جن پر بقول ان کے "نصاب کی تعریف عملاً صادق آتی ہے۔" اجی چند اپنا نصاب دسویں صدی ہجری کے نصف دوم کے آغاز پر تصنیف کرتا ہے جسے ہم بجا طور پر نصاب کہہ سکتے ہیں۔ خالق باری مرتب کرتے وقت حافظ محمود شیرانی کو اجی چند کے نصاب کا غالباً بالکل علم نہ تھا ورنہ وہ "قصیدہ در لغات ہندی" کے ساتھ اس کا ذکر بھی کرتے۔ حکیم یوسفی کے لغات ہندی اور اجی چند کی تصنیف کے زمانے میں کوئی زیادہ بڑے کا فرق نہیں ہے۔ اجی چند نے اپنی کتاب سنہ ۹۶۰ھ میں لکھی ہے اور حکیم یوسفی کی تصنیف "قصیدہ در لغات ہندی" سنہ ۹۵۰ھ کے لگ بھگ یا اس سے کچھ پہلے کی تصنیف ہے۔ خالق باری کے مصنف ضیاء الدین خسرو کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اسے اجی چند کے نصاب کا علم تھا یا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ خسرو کو اس نصاب کا علم رہا ہو اور اس نے خالق باری اسی کے تتبع میں لکھی ہو جس طرح سے خالق باری کے تتبع میں دوسرے بہت سے نصاب لکھے گئے۔

اردو زبان و ادب میں جس طرح بہت سی چیزیں ایران کی پیداوار ہیں اسی طرح نصابوں کی تیاری کا رواج بھی اردو میں ایران سے آیا ہے جہاں بچوں کو عربی زبان سکھانے کی غرض سے فارسی میں نصابوں کی تیاری کا دستور عام تھا۔ فارسی کی تحصیل کے لئے ہندوستان میں یہی نصاب ہندی میں تیار ہونے لگے۔

اجی چند نے فارسی نصابوں کے نمونوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنا نصاب تصنیف کیا ہوگا۔ یہ بات ذرا بھی متحیر کرنے والی نہیں کہ مسلم دور حکومت میں ہندوؤں بالخصوص کائستھوں کو فارسی زبان و ادب سے حد درجہ شغف ہوتا تھا اور وہ اس میں خاصا کمال پیدا کرتے تھے یہاں تک کہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کی قدرت بھی انھیں حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اجی چند نے چند فارسی نصابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور انھیں کے طرز پر اپنا "ہندوی" نصاب تیار کیا ہوگا۔

ہندوستان میں یا ایران میں پرانے جتنے بھی نصاب لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب فارسی زبان میں ہیں اور ان کا خاص مقصد بچوں کو عربی زبان کے الفاظ و محاورات سکھانا تھا۔ اگر اجی چند کا نصاب اردو کا سب سے قدیم نصاب ہے تو فارسی زبان کے نصابوں کو نمونہ بنا کر اردو میں نصاب تیار کرنے کا سہرا اجی چند کے سر ہے اور بلاشبہ اردو زبان میں اس صنف کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔

مراسلات

استفسار

راقم سطور کے پاس کسی قدیم مثنوی کا ایک ناقص الطرفین قلمی نسخہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کا نام "مثنوی خورشید وماہ" ہو، اور یہ اس بنا پر ہے کہ بعض شعروں میں یہ دونوں نام ایک ساتھ آئے ہیں مثلاً

اٹھایا ماہ نے گھونگھٹ کا پردا
کیا خورشید کو بن مول بردا

خورشید کے رفیقوں کے نام زحل، مشتری، زہرا اور بہرام ہیں۔ خورشید کے یہ سب ساتھی کسی وجہ سے اس سے بچھڑ گئے ہیں، زحل چوروں کے ایک گروہ کے ساتھ پکڑ کر خورشید کے سامنے لایا جاتا ہے، ان چوروں کے ایک سردار کا نام نسیم ہے۔ زحل اپنی سرگزشت خورشید سے بیان کرتا ہے جس میں مصر کی ملکہ کا ظلم، زنگی کی آفت اور جشنے کی فتح کے واقعات شامل ہیں۔ خود یہ خورشید بھی غالباً ابتدا میں مصر کا بادشاہ تھا۔ پھر اپنے ملک سے یہ کس طرح دور ہوگیا، اس کا ذکر جن اوراق میں ہوگا وہ اس نسخے میں نہیں ہیں۔

کوئی صاحب اگر کتاب کا صحیح نام، مصنف کا نام اور اس کا زمانہ وغیرہ بتاسکیں تو احسان مند ہوں گا۔

علی گڑھ۔ • محمد انصار اللہ

ایک شعر کے بارے میں

شاہ ظہور الدین حاتم استاد سودا کا ایک شعر ہے

دل کا کبوتر زریں نامہ بر گیا
تا اس کا راہ میں نہ کوئی پر کتر سکے

مجھے دریافت کرنا یہ ہے کہ کبوتر زریں، کبوتروں کی کونسی قسم ہے اور اس شعر میں کس رعایت سے کبوتر زریں نظم ہوا ہے۔ میں شکرگزار ہوں گا اگر کوئی صاحب ہماری زبان کے ذریعے میری رہنمائی فرمائیں۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب، پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب سے خصوصی توجہ کی درخواست کرتا ہوں۔

علی گڑھ • وحشی زادہ

استفسار

میرے ایک کرم فرما نے اپنی غزل میں جس کے ردیف "قافیہ نسلِ ہم ہے، اگر ہم ہے جگر ہم ہے وغیرہ ہیں صرف ایک شعر میں مرہم سے بھی استعمال کیا ہے جو موزونی اور صوتی اعتبار سے تو صحیح ہے لیکن کیا اصول قوافی کے لحاظ سے بھی مناسب ہے؟

اگر غزل میں برہم ہے، اگر ہم ہے، سرہم ہے وغیرہ قوافی ہوتے تو مرہم ہے بھی لانا مناسب تھا لیکن پوری غزل میں ایسے قوافی نہ ہونے سے ایک قافیہ مرہم سے کھٹکتا ہے اگر مناسب ہے تو کسی شعر کی سند کے ساتھ اس کا جواز اور نامناسب ہے تو کیوں؟

امید ہے کہ ماہرین فن حضرات تشفی بخش جواب عنایت کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

جبل پور • خاور

یہ نظم کس کی ہے؟

ایک مسدس جو اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی

داغ دہلوی کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ انقلاب دہلی مرتبہ نظامی بدایونی میں بھی داغ کے نام سے لکھا گیا ہے مگر اس میں داغ کا تخلص موجود نہیں ہے۔ میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں جا بجا ۱۲ اپریل ۱۸۶۹ء سے ۲۷ نومبر ۱۸۷۰ء تک مختلف تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس میں ایک مسدس ہے جس کے عنوان پر یہ الفاظ درج ہیں "شہر آشوب دہلی از تصنیف میاں تشنہ" اس کا پہلا مصرعہ وہی ہے۔ فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی۔ انقلاب دہلی میں اس مسدس میں ۲۲ بند ہیں اور بیاض میں ۲۰ بندوں کی ترتیب مختلف ہے اور جگہ جگہ الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ آخری بند میں تشنہ کا تخلص موجود ہے وہ بند نقل کیا جاتا ہے۔

کہاں تلک میں کہوں حال زار اے تشنہ
کسی کے ہوتا ہے دل بیقرار اے تشنہ
دعا یہ ہے مری لیل و نہار اے تشنہ
کہ پھر بسے کہیں اجڑا دیار اے تشنہ
جہاں آباد کو آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اُسے حسب مراد دکھلا دے

لکھنؤ۔ • سید مسعود حسن رضوی

ڈائرکٹر خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام ایک خط

میرے کچھ ساتھی آپ کے مذکورہ کورس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، ہماری زبان و دیگر پرچوں میں آپ کے خط چھپے ہیں۔ جس سے لوگوں میں اردو سیکھنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ میں جس جگہ ہوں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر یہاں ابھی آٹھ دس طلبہ اور مدرس اس کورس کے سلسلے میں کچھ معلومات چاہتے ہیں۔ براہ کرم آپ داخلہ فارم و دیگر معلومات بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں۔ فیس وغیرہ جو کچھ ہوگی وہ بھیج دی جائے گی۔ امید ہے آپ جواب جلدی دینے کی تکلیف گوارا کریں گے۔

اجمیر، راجستھان۔ • سید حسن

اخبار و اذکار

اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کا اسکولوں میں داخلہ

دلّی :- دلی میں اردو ذریعہ تعلیم کی جن طالبات اور طلبہ کو چھٹے درجہ اور نویں درجہ میں داخلہ نہیں مل سکا ہے ان سب کے داخلہ کا انتظام کیا جائے گا۔ ۱۵ رمئی تک تمام اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم کی طالبات اور طلبہ کا رجسٹریشن کیا جائے گا ممبر پارلیمنٹ مسز سبھدرا جوشی کی قیادت میں ایک وفد نے آج اس سلسلہ میں چیف ایگزیکٹیو کونسلر مسٹر رادھا رمن سے جو کہ محکمہ تعلیم انچارج بھی ہیں ملاقات کی تھی۔ چیف ایگزیکٹیو کونسلر نے ڈائرکٹر تعلیمات کو ہدایت کی کہ وہ پیر کے روز تمام اسکولوں کو سرکلر جاری کردیں کہ تمام اسکول اردو ذریعہ تعلیم کی طالبات اور طلبہ کا ۱۵ رمئی تک رجسٹریشن کریں، اس وقت تک جتنی طالبات اور طلبہ کا رجسٹریشن ہو جائے گا، انھیں داخلہ ملے گا۔ ڈائرکٹر تعلیمات نے تسلیم کیا کہ بلیماران میں کوئی اسکول بنیادی طور پر ہندی ذریعہ تعلیم کا نہیں ہے اور جو اسکول ہیں ان میں اردو ذریعہ تعلیم کی طالبات کا داخلہ ہو سکتا ہے۔

• الجمعیۃ دہلی

جمعیۃ علما کے اجلاس میں اردو سے متعلق تجویز

دہلی :- جمعیۃ علماء ہند کے ۲۳ ویں اجلاس عام میں اردو سے متعلق بھی ایک تجویز منظور کی گئی۔

اس تجویز میں یوپی، بہار، دہلی، مدھیہ پردیش اور دیگر مقامات پر اردو کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد از جلد اردو کو اس کا قانونی حیثیت دے اور صوبائی حکومتیں اس کی تعلیم کا سامان کریں نصابی کتب کے فقدان سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کریں اور اس کے لئے اساتذہ تیار کریں۔

الجمعیۃ دہلی۔

اردو کا حق قانونی طریقوں سے حاصل کرنے کا مشورہ

جناب فخرالدین علی احمد مرکزی وزیر زراعت نے جمعیۃ علماء ہند کے ۲۳ ویں اجلاس عام میں اردو کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے بارے میں آپ میرے انداز فکر کو جانتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو کو اس کا وہ حق نہیں ملا جو اسے ملنا چاہیے یہ بہت ضروری ہے کہ پرائمری اسکولوں میں اس کے استعمال کا اچھا بندوبست کیا جائے یہ حق ہمیں حاصل کرنا چاہیے اور اس کے لئے ان تمام قانونی طریقوں کا استعمال ہونا چاہیے جو ملک نے ہم کو دئے ہیں یہ ایک بات ہوئی لیکن معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خود ہم کو اپنی زبان کے لئے جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ ہم نے نہیں کیا جو ذرائع اردو کی اچھی کتابوں کو شائع کرنے کے لئے حکومتوں نے فراہم کئے ہیں ہم انھیں کام میں نہیں لاسکے۔ اردو کی اچھی اور نئے ماحول سے ہم آہنگ کتابیں کم شائع ہوتی ہیں اور ان کے بغیر بچوں کی تربیت ممکن نہیں جن کے لئے زبان کے حقوق مانگے جاتے ہیں اور آخر میں جن پر زبان کی ترقی کے لئے بھروسہ کرنا ہوگا اس سلسلہ میں دلی کی نئی سرکار نے جو فیصلے کئے ہیں میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دوسری ریاستی حکومتیں بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے ہمارے الیکشن مینی فیسٹو میں اردو کے متعلق جو وعدہ کیا گیا ہے اس کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کی جارہی ہے۔

الجمعیۃ دہلی

اردو کو ضرور اس کا جائز حق ملے گا

انجمن شعر و ادب کے استقبالیہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ راجستھان جناب برکت اللہ خاں صاحب نے اردو کے متعلق فرمایا کہ اردو ایک قیمتی زبان ہے اور ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے یہاں ہر زبان کو پھولنے پھلنے کا حق حاصل ہے یہ تو ہمیں تسلیم کرلینا چاہئے کہ ہمیں آج ہندی کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ اردو، پنجابی، سندھی غرضیکہ تمام قومی زبانوں کو ترقی کرنے اور زندہ رہنے کا موقع ملنا چاہئے انھوں نے کہا کہ ہمیں زبان کے بارے میں سخت رویہ ہرگز نہیں اپنانا چاہئے اور نہ ہی زبان کو ثقیل اور سخت بنانا چاہئے اس سے زبان عوام سے دور ہو جاتی ہے انھوں نے فرمایا کہ زبانوں سے نفرت کرنا اختلافات کو ہوا دیتا ہے ایک زمانہ تھا کہ یہ نفرت عروج پر تھی لیکن اب رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے، وہ دن بھی تھے کہ جب کوئی دوکاندار اردو کے ردی اخبار میں کوئی سودا باندھ کر دیتا تھا تو خریدنے والا کہتا تھا کہ پڑیا میں سے بدبو آرہی ہے لیکن آج حالات بدل چکے ہیں اب یہ ذہنیت زیادہ دن چلنے والی نہیں ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ اردو کے ساتھ ضرور انصاف کیا جائے گا۔

بدلتا ہوا زمانہ

اردو یونیورسٹی

لکھنؤ :- شری رام سنگھ گھنہ (کانگریس) کے ایک سوال کے جواب میں جس میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ کیا سرکار یہ بتانے کی زحمت کرے گی کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا کوئی منصوبہ حکومت کے زیر غور ہے اگر ایسا ہے تو کب تک عملدرآمد ہوگا۔

اس سوال کے تحریری جواب میں بتایا گیا کہ اس معاملہ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا ہے۔

• سیاست کانپور

اردو کے مدارس کو سہولتیں

حیدرآباد۔ وزیر بلدی نظم و نسق جناب ایم مانک راؤ نے اپنے اس ایقان کا اظہار کیا کہ تلگو کے ساتھ ساتھ اگر اردو میڈیم کے مدارس کو بہتر اساتذہ اور دیگر سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی تو اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کسی بھی دیگر زبانوں کے طلبہ سے مسابقت کرنے کے اہل بن سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خود ان کا ذریعہ تعلیم اردو رہا ہے لیکن وہ کسی بھی سرکاری یا سیاسی کاروبار کے انجام دہی میں دقت محسوس نہیں کرتے۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعہ یونیورسٹی سطح پر علاقائی زبان میں تدریس کے تجربہ کے ذریعہ ہندوستان کی تمام زبانوں اور ریاستوں کی رہبری کی ہے۔ وزیر موصوف حافظ بوائز ٹاؤن کے ساتویں سالانہ جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔

• رہنمائے دکن

جی او (۱۸۰۰) سے متعلق شکوک و شبہات غلط فہمی پر مبنی

حیدرآباد۔ جناب سید رحمت علی ایم ایل اے نے اپنے صحافتی بیان میں کہا ہے کہ جی۔ او (۱۸۰۰) کے تعلق سے اردو دانوں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں وہ محض غلط فہمی کی بنیاد پر ہیں۔ چیف منسٹر آندھرا پردیش نے حال ہی میں انجمن ترقی اردو کے ایک وفد سے اردو کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اس جی او کے تعلق سے وضاحت کی ہے چیف منسٹر نے اس موقعہ پر سکریٹری تعلیمات کو ہدایت کی ہے کہ بہت جلد ایک اور جی او جاری کیا جائے تاکہ اردو داں وں کے شکوک و شبہات دور ہو سکیں اور سرکاری ملازمتوں میں اردو بولنے والے امیدواروں کے تقررات کے سلسلہ میں وضاحت ہو سکے۔

انھوں نے توقع ظاہر کی کہ حکومت آندھرا پردیش جو اردو کو ایک علاقائی زبان تسلیم کر چکی ہے اس زبان کی ترقی اور نظم و نسق میں اس کو اس کا حق دینے کے لئے اچھی پالیسی اختیار کرے گی۔ انھوں نے اردو داں وں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے کسی منفی رجحان کی بجائے مثبت پالیسی اختیار کریں اور محض شکوک و شبہات کی بناء پر کوئی واضح موقف اختیار کرلینے کی بجائے حکومت کے اعلیٰ نمائندوں سے بات چیت کے ذریعہ مسائل کی یکسوئی کی صورت نکالیں۔ مسٹر رحمت علی نے یقین دلایا ہے کہ وہ اردو کے ساتھ کسی بھی ناانصافی اور حق تلفی کے خلاف موثر نمائندگی کریں گے۔

• سیاست حیدرآباد

محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت

حیدرآباد۔ بانی شہر حیدرآباد اور قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب و ثقافت کے علمبردار گولکنڈہ کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کو ان کے مزار پر ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جناب ایم آر شیام راؤ ریاستی وزیر آثار قدیمہ نے جو محمد قلی کے شہر حیدرآباد کے میئر بھی رہ چکے ہیں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آندھرا پردیش اور حیدرآباد میں محمد قلی کے دور کے لسانی و تہذیبی اتحاد و یکجہتی کی روایات آج بھی برقرار ہیں۔

جناب شیام راؤ نے کہا کہ ریاستی حکومت اردو کی ترقی سے دلچسپی لے رہی ہے اور وہ اس قسم کی قومی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کی ممکنہ حوصلہ افزائی کرے گی۔

• رہنمائے دکن

یونیورسٹیوں میں اردو ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہیے

بمبئی۔ مہاراشٹر راجیہ سبھا کی ممبری کے انتخاب میں ڈاکٹر ایم۔ آر۔ ڈیاس کے کامیاب ہونے کی خوشی پر مہاراشٹر اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک خیر مقدمی تقریب کے موقع پر ریاستی وزیر زراعت نے نہایت شائستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹیوں میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم نہیں بنانا چاہیے انھوں نے زور دے کر کہا کہ صرف اردو یا ہندی ہی ایسی زبانیں ہیں جو یونیورسٹی کی سطح پر کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا

تبصرے

وحید اختر

دیوانِ درد

مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
ناشر: مکتبہ شاہراہ، دہلی
قیمت: چھ روپے

دیوانِ درد

مرتبہ: رشید حسن خاں
ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی، قیمت: دو روپے پچھتر پیسے

اس وقت میرے سامنے دو حضرات کے مرتب کیے ہوئے دو ایڈیشن دیوانِ درد کے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی نے کئی قلمی نسخوں اور مروجہ دیوان کے تقابل کی بنیاد پر جو ایڈیشن مرتب کیا ہے وہ ایک حد تک محنت طلب کام تھا لیکن رشید حسن خاں نے مکتبہ جامعہ کے معیاری ادب سلسلے کی سستی کتابوں کے لئے "ایڈیٹنگ" کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ایڈیٹنگ کے بنیادی تقاضے کی تکمیل بھی نہیں کرتا۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتب کئے ہوئے دیوان کا پہلا ایڈیشن کئی برس قبل شائع ہوا تھا۔ پہلے ایڈیشن کا مقدمہ رسمی اور سرسری تھا اس پر "ہماری زبان" ہی میں تبصرہ کرتے ہوئے میں نے تصوف پر درد کی تصانیف خصوصاً علم الکتاب اور رسائلِ اربعۂ درد کی طرف مرتب کی توجہ دلائی تھی اور تصوف کے ضمن میں درد کے خصوصی کارنامہ پر روشنی ڈالی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ نئے ایڈیشن کے مقدمے کو نسبتاً زیادہ جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے درد کے مسلک "توحیدِ محمدی" کے کشف اور اس کے بعض فروعات سے بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوان کے مقدمے میں تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہ تھی اس لئے مرتب نے سرسری جائزے پر اکتفا کیا ہے۔ اس مقدمے کی افادیت یہ ہے کہ ادب کے طلبہ کو درد کے نظریۂ تصوف کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا۔ تصوف کے مسائل سے پہلے ایڈیشن کے مقدمے کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

اس مقدمے کا تنقیدی حصہ ایک حد تک رسمی آرا پر مبنی ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے درد کو خالص صوفی شاعر ثابت کرنے کی فکر میں ان کے یہاں عشقِ مجازی کے امکانات سے یکسر انکار کیا ہے، اور اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی رایوں سے اختلاف کیا ہے جو صحیح نہیں۔ درد کے تقشف کی پاسداری سے ان کی شاعرانہ شخصیت کے سب سے جاندار پہلو کا انکار ہوتا ہے۔ میں نے بھی اپنے مقالے میں اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ درد کی عشقیہ شاعری میں جو بشریت اور سچے تجربے کی جھلک ہے وہ شاہد ہے کہ درد نے عنفوانِ شباب میں کسی معشوقِ ارضی سے ضرور دل لگایا ہوگا۔ ظہیر احمد صدیقی ارضی عشق کو درد ایسے صوفی کے شایانِ شان نہیں سمجھتے حالانکہ خود صوفیا عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کے لئے لازمی قرار دیتے آئے ہیں۔ شیخ مجدد الف ثانی ایسے متشرع اور تقشف پسند بزرگ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں اپنی اس دیوانگیٔ شوق کا اعتراف کیا ہے۔ درد صرف شاعر ہی نہیں تھے موسیقی کے رمز شناس بھی تھے، ان کی زندگی میں عشق کا امکان کہیں زیادہ قوی ہونا چاہئے۔ ظہیر احمد صدیقی نے صرف خارجی شواہد پر زور دیا ہے، حالانکہ شاعر اور شاعری کو سمجھنے کے لئے کلام کے داخلی شواہد زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ اگر درد کو عشق کا سچا تجربہ نہ ہوا ہوتا تو ان کی متصوفانہ شاعری بھی داخلی آہنگ سے محروم رہتی۔ اس معاملے میں بہرحال اختلاف اور بحث کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تالیف کے گردپوش کے آخری صفحے کے اس حصے پر نظر رک جاتی ہے جہاں مثنوی سحرالبیان، مثنوی گلزارِ نسیم، جذباتِ رضی اور دیوانِ درد کو ان کی تصانیف کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حالی جیسے محتاط بزرگ تو اپنی تصنیف کو بھی انکسارًا "تالیف" لکھتے تھے۔ تالیف یا ترتیب کو تصنیف کے درجے میں داخل کرنا حیرت ناک ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری ایک حد تک ناشر یا کاتب پر بھی عاید ہو سکتی ہے، ممکن ہے مرتب کا یہ مدعا نہ ہو۔ اس دیوان کی کتابت و طباعت ناقص ہے۔ اس معاملے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ ایڈیشن کے بعد اگر رشید حسن خاں کے مرتبہ دیوان کو دیکھا جائے تو مقدمے سے لے کر فرہنگ تک جس سہل انگاری کا مظاہرہ محقق علامہ نے فرمایا ہے، اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ اس طرح ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ دیوان کی اہمیت کچھ اور بڑھ جائے۔

رشید حسن خاں کا مرتب کیا ہوا دیوانِ درد کئی اسباب کی بنا پر خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ایک تو اس لئے کہ موصوف نے اسی طرح مکتبہ جامعہ کے لئے کئی کتابیں ایڈیٹ کی ہیں۔ ان کے زیرِ نظر کارنامے کا تنقیدی مطالعہ ان کی اسی قبیل کی دوسری تحقیقات کے پایۂ اعتبار اور نوعیت کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔ دوسرے اس لئے کہ رشید حسن خاں محققین کی اس امت کے فرد ہیں جو قاضی عبدالودود کی تقلید کرتے ہوئے ہر تحقیقی کام میں (تحقیقی کم اور فرضی زیادہ) اغلاط کی محض نشان دہی کو تحقیق کا منتہا و مدعا جانتی ہے۔ اس قماش کے جید حضرات سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی موضوع پر وہ خود کوئی تحقیقی کارنامہ پیش کریں تاکہ ہمیں ان کے معیار کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اپنی علمیت کے مظاہرے کے لئے کسی دوسرے کی تصنیف یا تحقیق کا انتظار کرنا اپنی شہرت کے لئے دوسروں کے کام کی محتاجی کے سوا کچھ نہیں جس طرح کی منفی تحقیق کو رشید حسن خاں

تخلیقی ادب اور تمام علوم پر فوقیت دیتے ہیں اسے علم کہنا بذاتِ خود علم کی عزت افزائی نہیں۔ اگر علم کسی مخطوطے کو نقل کرنے کا نام ہے تو ہر کاتب کو عالم ماننا پڑے گا۔ اگر علم حرف شناسی اور املا کی نشاندہی کے مترادف ہے تو ہر پروف ریڈر علم کے سب سے بلند درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ اگر علم کرم خوردہ کاغذوں کی بو میں لذت "تلاش" کرتا ہے تو ردی کاغذ کا ہر بیوپاری، اگر قسمت یاوری کرے تو محققِ اعظم بن سکتا ہے۔ اگر علم محض کسی کے سنِ وفات، سنِ ولادت، نسل، آباؤ اجداد کے تذکرے اور اس کے مختلف قلمی دیوانوں سے واقفیت تک محدود ہے تو دنیا کے سارے کتب خانے جو زندہ تخلیقی ادب اور دوسرے علوم کے تحقیقی کاموں سے اٹے پڑے ہیں، سوختنی قرار پائیں گے اور علوم کے بڑے سے بڑے عارف کو کسی نیم خواندہ ملائے مکتب یا نیم وحشی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑے گا۔ رشید حسن خاں اردو کے ان محقق علما کے سرخیل ہیں جنھیں قاضی عبدالودود کی وسعتِ مطالعہ اور نظر تو میسر نہیں مگر ان کے مزاج کی جارحیت اور نکتہ چینی ضرور ہاتھ لگ گئی ہے، اس لیے کہ اس سے آسان کام کوئی اور نہیں، ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ انتظار حسین نے اس قماش کے ایک اور محقق (خلیل الرحمٰن داؤدی) کے مرتبہ دیوانِ درد پر تبصرہ کرتے ہوئے اس تحقیق کے بعض مضحک پہلوؤں کی طرف بڑے مزے میں اشارے کیے تھے جن میں سے ایک یہ ہے کہ "ایسا ہر محقق ایک بار خم ٹھونک کر محمد حسین آزاد کو للکارنا ضروری سمجھتا ہے۔" یہ عادت جب راسخ ہو جائے تو پھر خواب اور بیداری میں ہر مصنف، ادیب اور شاعر کو للکارنا ہی محقق کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ ان حضرات کی حقیقی مشکل یہ ہے کہ یہ خود کتاب تصنیف کرنے کے اہل نہیں ہوتے اس لیے انتقاماً صاحبِ کتاب کے دشمن ہو جاتے ہیں اور اس کی مفروضہ خامیوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں تاکہ اپنے لیے یہ جواز نکال سکیں کہ کتاب لکھنا کوئی اچھا کام نہیں۔ ہماری تحقیق کی موجودہ سمت نے ان حضرات پر "صاحبِ کتاب" بننے کی مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ خدا بھلا کرے یو۔جی۔سی اور اشاعتی اداروں کا کہ کسی دوسرے کی کاوش کو نقل کر کے اس پر دو چار صفحات کا مقدمہ تحریر فرما کر اب صاحبِ کتاب بلکہ "کثیر التصانیف بزرگ" بننا بھی بچوں کا کھیل ہو گیا ہے۔ رشید حسن خاں کے صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ دیوانِ درد کے علاوہ "انشا" میں "دو میر"، "انتخاب مراثی (انیس و دبیر)"، "انتخاب نظیر"، "مقدمہ شعر و شاعری"، "حیاتِ سعدی"، "گلزارِ نسیم"، "گذشتہ لکھنؤ" اور "مقالاتِ شبلی" سب ان کی قلمرو میں داخل ہو چکی ہیں۔ اگر موصوف کے شوقِ تصنیف کا یہی حال رہا تو چند برس بعد اس مسئلے میں تحقیق کرنی پڑے گی کہ ہمارے کلاسیکی ادب کا کتنا حصہ دراصل کس مرتب یا مؤلف کی تصنیف کے زمرے میں آتا ہے۔ ان تمام تحقیقی کارناموں کے معیار کا اندازہ کرنے کے لیے مؤلف موصوف کے "دیوانِ درد" کا جائزہ سودمند ہو گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ خاں صاحب کی دوسری تالیفات اور ان کے مقدمہ و فرہنگ پر بھی تحقیقی نظر ڈالی جائے۔

ظہیر احمد صدیقی کے برخلاف رشید حسن خاں نے درد کی تصانیف کو سمجھنے سمجھانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی شاید اس لیے کہ تصوف کو سمجھنے کے لیے جس مبلغِ علم کی ضرورت ہے وہ مخطوطہ شناسی سے ہٹ کر بھی بہت کچھ جاننے کا تقاضا کرتا ہے۔ درد کی متصوفانہ شاعری کے متعلق جو ارشاداتِ عالیہ صفحاتِ سرسری اور کلی تعارف میں بکھرے ہوئے ہیں ان سے میرے اندیشے کی توثیق ہوتی ہے۔ ان ارشادات میں تنقیدی شعور کی جس سطح کا اظہار ہوا ہے وہ بھی توجہ طلب ہے۔ پہلے تو وہ درد کو صوفی شاعر ماننے ہی کیلئے تیار نہیں۔ تصوف سے ان کی مراد شاید چند کلمات و اصطلاحات کا بے جا اعادہ ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تصوف حیات و کائنات، فرد کی اپنی ذات اور تمام عالمِ انسانیت کی جانب ایک مخصوص رویہ ہے جس کا اظہار مختلف سطحوں اور شکلوں پر مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ خالص عشقیہ شاعری سے لے کر سماجی، سیاسی تنقید تک سب ایک حد تک متصوفانہ شاعری کے ذیل میں آ سکتی ہیں۔ موصوف نے ایسے اشعار کو جن میں تصوف کی اصطلاحات نظم کر دی گئی ہیں درد کے خالص متصوفانہ اشعار قرار دیا ہے (ص ۵۰)۔ محقق مذکور کا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے کہ میر کے کلیات میں بھی خالص متصوفانہ شعر درد کے دیوان سے کم نہیں ملیں گے (ص ۵۰)۔ خالص متصوفانہ اشعار کی جو تشریح موصوف نے اوپر فرمائی ہے اس لحاظ سے اگر وہ میر کے یہاں سے اصطلاحی شعر درد کے برابر نکال سکیں تو یہ ان کا پہلا وقیع تحقیقی کارنامہ ہو گا۔ میر یقیناً درد سے عظیم تر شاعر ہیں، لیکن ان کو تصوف میں درد کا ہم پایہ قرار دینے سے نہ تو ان کی عظمت بڑھتی ہے نہ درد کی شاعری کم حیثیت ہوتی ہے۔ درد کا بنیادی رویہ متصوفانہ ہے، ان کے عشقِ مجازی کو بھی اسی کا سلسلہ کہا جا سکتا ہے۔ میر کا رویہ بنیادی طور پر متصوفانہ نہیں بلکہ وحدت الوجودی طرزِ فکر جو اس زمانے کی شاعری میں عموماً ملتا ہے، ان کی شخصیت کے اظہار کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ اصطلاحات تو میر سے زیادہ غالب کے متصوفانہ اشعار میں مل جائیں گی۔ کیا اس کی بنیاد پر رشید حسن خاں ایسا محقق غالب کو بھی تصوف میں درد کا ہم پلہ مان لے گا۔ تصوف ناشناسی کا اظہار موصوف کے ان جملوں سے بخوبی ہوتا ہے:

"ان کے اشعار میں حیرت و حسرت کا جو عام عالم ہے، وہ سالک کی کیفیت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا" (ص ۹)

"اسی طرح ان کے یہاں بے اطمینانی اور تسکین ناتمام کی جو کیفیت ہے اس کا بھی مذہب سے کچھ تعلق نہیں" (ص ۹)

"یہ اضطراب اور یہ کم یقینی کا عالم اس سرشاری یا اس سرمستی احساس سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا جو تصوف کا عطیہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف خاص طور پر میر کے جو مضامین نہایت درجہ حسرت زدگی کے ساتھ ان کے یہاں صرفِ بیان میں آئے ہیں وہ تو تصوف سے بہت دوری کی نسبت رکھتے ہیں۔" (ص ۷)

اس نثر کی خوبی سے قطع نظر رشید حسن خاں یہ بھی نہیں جانتے کہ حیرت سالک کے مقامات میں سے ہے۔ بے اطمینانی و تسکین ناتمام صوفی کا اس ذوق و شوق کا لازمی نتیجہ ہے جو اسے اپنی تکمیل کے لیے بے چین رکھتا ہے۔ درد کی جس کیفیت کو موصوف نے اضطراب اور کم یقینی قرار دیا ہے اگر انھیں صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا رشتہ تصوف اور تشکیک سے جوڑا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں کو تحقیق اتنی فرصت ہی کہاں دے گی کہ وہ تصوف کی اور کتابیں نہیں تو اقبال کی فلسفۂ عجم ہی کا مطالعہ کریں، تاکہ صوفیوں کے اضطراب کا سبب سمجھ سکیں۔ اقبال نے تصوف اور تشکیک میں بجا طور پر ایک تعلق دریافت کیا ہے۔ تصوف یقین کی انتہا ہونے کے باوجود تشکیک کے مرحلے سے گزرتا ہے یا بار بار گزر سکتا ہے، جیسے مسئلے میں درد کے مسلک ہی کو سمجھنا ہو تو میری کتاب "مباحثِ تصوف (خواجہ میر درد)" کا مطالعہ محقق مذکور کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ جبر و قدر کے معاملے میں درد نے درمیان کی راہ اختیار کی ہے۔ مختلف احساس کیفیات کے تحت کبھی وہ جبر کی کارفرمائی دیکھتے ہیں، کبھی انسان کے اختیار کا اثبات کرتے ہیں

دگو اور دُد چار دوال حال تحقیق تو اسے تضاد کہے گی مگر در اصل یہ تضاد نہیں۔ رشید حسن خاں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف کے مباحث ان کی رسائی سے باہر ہیں، اس لیے اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے اس مسئلے پر مزید داد تحقیق دے کر اپنا اور دوسروں کا وقت خراب نہیں کیا۔

محقق مذکور کی تصوف ناشناسی شعر ناشناسی کا پیش خیمہ ہے۔ کلاسیکی شاعری کو عموماً اور درد کی شاعری کو خصوصاً تصوف سے واقفیت کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ تصوف کا علم نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن خاں کی تنقید شعر بھی بے معنی الفاظ و اصطلاحات کا گورکھ دھندا بن گئی ہے۔ وہ درد کے متصوفانہ رنگ کو بھی ان کی حقیقی شاعری نہیں مانتے اور خالص تشبیہ انداز کو بھی ان کا نمائندہ رنگ نہیں سمجھتے۔ پہلے تو شاعر کو خانوں میں بانٹنے کی کوشش خود غیر شاعرانہ ہے، دوسرے درد کے حقیقی رنگ کا بھی کچھ ذکر تو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ یہاں تحقیق کی شرح و بسط کے بجائے غزل کی زبان کے ایجاز و ابہام کا سہارا لیتے ہیں وہ درد کے اسلوب کو رمزیہ اسلوب مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ درد کے نمائندہ کلام کی خصوصیت ہے حیرت و حسرت کے اظہار میں سنبھلی ہوئی ناتمامی جس میں بے تسکینی کی ہلکی آنچ شامل ہے" (ص ۸)

ان بے معنی ترکیبوں اور ملفوظات کی شرح کے لئے اس جذب بے ہوشی کی ضرورت ہے جو تنقید کے میدان میں قدم رکھتے ہی ؛ صرف رشید حسن خاں ایسے جید محقق پر طاری ہو سکتی ہے۔

چند صفحات کے اس مختصر سے پیش لفظ میں تنقید، ادب و تصوف کے ایسے ہی جواہر پارے سطر سطر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جس طرح کی منفی تحقیق رشید حسن خاں کا منتہائے نظر ہے وہ ادب فہمی و تنقید شعر کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اس طرح کے ذہن کو عموماً شعر فہمی مبداءِ فیاض سے ودیعت ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے اپنے میدان کو چھوڑ کر تنقید و تصوف کے مباحث میں پڑنا خاں صاحب کے منصب تحقیق کے شایان شان نہیں۔ تحقیق کی ابتدائی منزل سے آگے جو منزل آتی ہے وہ ادب کا عرفان اور بہت بلند علمی سطح چاہتی ہے۔ یہاں لفظوں اور حروف کی تصحیح اور متن کا تعین کام نہیں آتا۔ یہیں تحقیق بذات خود علم بن جاتی ہے اور اگر جز نظر بن سکے تو تخلیق کی اولین سطح تک بھی پہونچ سکتی ہے۔ ہمارے کچھ محققین خصوصاً رشید حسن خاں، خیاطی کے فن کو صرف بخیے ادھیڑنے کا فن سمجھتے ہیں، موزوں جامے قطع کرنا اور معانی کو قالب موزوں عطا کرنا ان کی بساط سے باہر ہے۔ صرف بخیے ادھیڑنا یا پھٹے پرانے کو رفو کرنا بھی درزی کا کام نہیں مگر محقق علام شاید تحقیق و تنقید کو درزی کے کام سے بھی آسان سمجھتے ہیں۔

۸ صفحات کے تعارف میں جہاں رشید حسن خاں نے مختلف مسئلوں اور فنون سے بحث کی ہے وہاں محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے صحیح میدان میں اشہب قلم کی جولانی دکھا رہے ہیں یہاں تو کوئی مخطوط شناس ہی ان سے الجھ سکتا ہے۔

اس کتاب کی فرہنگ بھی لائق توجہ ہے کیونکہ رشید حسن خاں نے اس قسم کی فرہنگیں اپنی دوسری "تصانیف" کے ساتھ بھی منسلک کی ہیں۔ ایک محقق کو کم از کم اتنا تو علم ہونا ہی چاہیے کہ لغت اور فرہنگ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فرہنگ میں وہ معنی دیے جاتے ہیں جو کتاب کے متن سے موافقت رکھتے ہوں نہ کہ ہر معنی۔ یہیں اس فرہنگ سے بطور مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں پیش کروں گا۔

اہل اشتغال: کاموں میں مصروف لوگ (ص ۱۴۸)

اگر رشید حسن خاں اشتغال کو تصوف کی اصطلاح سمجھتے تو تشریح اس قدر مضحکہ خیز نہ ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ اس کے باوجود خاں صاحب کو تصوف دانی کا بھی دعویٰ ہے۔

بار ہونا: دخل پانا، رسائی پانا (ص ۱۴۹)

موصوف نے "بار پانا" اور "بار ہونا" کو ایک سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں محاوروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ درد کا شعر جہاں سے انھوں نے یہ محاورہ لیا ہے وہ بھی اس معنی پر کہیں دلالت نہیں کرتا۔

اوروں سے تو گرانی یک لخت اٹھ گئی ہے

اے درد اپنے دل کے کیا بار ہو تو ہم ہیں

گرانی اور بار کے التزام پر محقق نے توجہ نہیں کی۔ حالانکہ تحقیق سے آگے بڑھ کر انھیں تنقید کا بھی شوق ہے۔

جگر دوزی کی: دل کے سارے زخم سی دیے یا دل کے زخم اور گہرے کر دیے (ص ۱۵۲)

دو متضاد معنی میں سے شعر میں صرف ایک ہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں اس لیے دوسرے معنی کا شمول غلط ہے۔

جسمی برشتہ: حسن ملیح جس کے رنگ کی تہ میں سرخی جھلکتی ہو۔ پکا رنگ (ص ۱۵۴)

ملیح کے معنی ہیں سانولا یا نمکین۔ پکا رنگ بھی اس کی ضد ہے اور رنگ میں سرخی جھلکنا بھی ملاحت سے تعلق نہیں رکھتا۔ برشتہ کے معنی ہیں بھنا ہوا، جس کا مفہوم ہوگا جلا ہوا۔ ایک لفظ کے ایسے متضاد و مختلف معنی ایک محقق ہی دریافت کر سکتا ہے۔

جمعیت: تسلی، اطمینان، گروہ (ص ۱۵۳)

اس جگہ کم از کم "گروہ" کے لفظ کو حذف کر دینا چاہیے تھا اس لئے کہ لفظ کے محل استعمال سے کہیں یہ معنی صادر نہیں ہوتے۔

ساحت: وسعت، کشادگی، علاقہ (ص ۱۵۰)

ساحت کے اصلی معنی "میدان" درج ہی نہیں کئے گئے۔

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں، اس طرح کی مثالیں کثرت سے پیش کی جا سکتی ہیں، سوال یہ ہے کہ اس طرح کی فرہنگ سے طلبہ یا

(باقی صفحہ ۹ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ سے چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا